دعوتِ اسلامی کے اساسی اصول و شرائط

(سورہ النحل کی آخری آیات کی روشنی میں)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

(۲)

دعوت کے لیے زبان و اسلوب کسی بھی سطح پر دعوت دینے کے لیے زبان کے مختلف نمونے اور کلام کے معیارات قرآن مجید میں اور حدیث شریف میں موجود ہیں۔ قرآن حکیم نے شہریوں اور دیہاتیوں، عالموں اور عامیوں، سرداروں اور پیروکاروں سب کو مخاطب کیا ہے۔ اور پھر ہر قسم کے حالات میں طعن و طنز سنتے ہوئے بھی اور تشدد سہتے ہوئے بھی، صلح کی فضا میں بھی اور کشیدگی کے ماحول میں بھی، پُرامن سماجی مجالس میں بھی اور جنگی حالات میں بھی ___ اسلام کی دعوت دینے کا کام پیغمبرؐ اور صحابہؓ نے جاری رکھا ہے۔ دعوت جتنے بھی مختلف اسالیب میں دی جاتی رہی، ان سب میں ایک مشترک معیار موجود ہے۔ اس معیار کو کبھی پست نہیں ہونے دیا گیا۔

سو آج بھی صاحبانِ اسلام کو دعوت کی زبان قرآن کے خطبوں اور رسولِ پاکؐ کی تقریروں اور گفتگوؤں سے لینی چاہیے اور مختلف احوال و ظروف کے مطابق مختلف اسالیب سے کام لیتے ہوئے اصولی معیار کو برقرار رکھنا چاہیے۔ تین چیزوں یعنی خلوص، راست گفتاری اور سنجیدگی کے عناصر داعیانِ حق کے کلام و خطاب میں کبھی ضائع نہیں ہونے چاہییں۔

حکمت کا اصل منشا یہ ہے کہ بصیرت مند داعی ہمیشہ اس بات پر نظر رکھے کہ کس وقت وہ کیسے مخاطبین سے بات کر رہا ہے، کن مسائل میں گھرے ہوئے لوگوں کو اسلام کی طرف بلا رہا ہے، تاریخ کے کیا حوادث آس پاس نمودار ہو رہے ہیں، دوسری کونسی تحریکات یا کون سے نظریات اور مذاہب میدان میں کتنی کتنی طاقت اور کتنے کتنے اثر کے ساتھ موجود ہیں اور ان کے کمزور پہلو کیا ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کسی معاشرے

ہیں کیا مفید یا مضر تبدیلیاں آ رہی ہیں، کب دینِ حق کی کتنی پیش قدمی کدھر سے ممکن ہے۔ کن موضوعات سے بات کا آغاز کر کے اُسے کس طرح اصل مدعا تک پہنچانا ہے، داعیِ حق کے پاس کتنی افرادی قوت ہے، کتنے وسائل قوت اُسے حاصل ہیں، پیشِ نظر معاشرے سے کتنی حمایت اُسے مل رہی ہے، علمی سطح پر کیسے خیالات پھیل رہے ہیں، تعلیمی دائرے میں نئی نسلوں کے ذہنوں کی آبیاری کس طرح کی جا رہی ہے، صحافت و ادب کے ذریعے کس کس طرح کی لہریں دلوں میں اُٹھ رہی ہیں، ثقافتی مظاہر اور تقاریب اور ادارے انسانی رجحانات کو کس طرف موڑ رہے ہیں، حکمران قوت اور سیاسی جماعتیں کیا پارٹ ادا کر رہی ہیں، پہلے سے موجود یا نو وارد مذاہب کی تبلیغی سرگرمیاں کیا اور کیسی ہیں، خصوصاً خود اسلام ہی کے نام سے مختلف گروہ کس شانِ تفرقہ سے کام کر رہے ہیں، اور مخاطبین کی ذہنی و اخلاقی سطح کیا ہے؟

ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دعوت کا راستہ اور اسلوب متعین کرنا پڑتا ہے۔ اس کی رفتار اور تدریج کا اندازہ قائم کیا جاتا ہے۔ نیز اسلام کی دعوت دینے والے اس امر کا بھی فیصلہ دینی حکمت سے کرتے ہیں کہ کن چیزوں سے تعرض نہیں کرنا ہے اور کن پر اولین توجہ دینی ہے، مقدم کیا ہے اور موخر کیا ہے، زور کس بات پر صرف کرنا ہے اور کن اُمور کو سرسری حد تک چھیڑنا ہے، کن طاقتوں سے ہم آہنگی ضروری ہے، کن کا تعاون حاصل کرنا ہے، کن کی مخالفت کرنی ہے، کن کو نظر انداز کرنا ہے۔

پھر حکمت ہی کے ذریعے بیطے ہوتا ہے کہ قول لیّن (نرمی گفتار) اور قول بلیغ (کلام دلنشیں) سے کہاں کام لینا ہے، کون سے مواقع ہیں جہاں لکم دینکم ولی دین کہہ کر الگ ہو جانا مناسب ہوتا ہے، اور کن صورتوں میں واغلظ علیھم کی صورت اختیار کرنی پڑتی ہے۔ متلاشیانِ حق اور طالبانِ ہدایت سے معاملہ اور طرح ہوتا ہے، اور متکبر کیش منکرین و معاندین سے کسی اور انداز پر۔ لیکن سارے مختلف احوال و ظروف میں دعوت کے لیے "قولِ سدید" کا جوہر برقرار رہتا ہے، یعنی سچی، کھری، واضح اور محکم بات! قولِ سدید کے لیے پیرایۂ بیان بھی مناسب ہونا چاہیے۔ خطیبانہ ساحری اور واعظانہ نکتے اور فقیہانہ موشگافیاں دوسری چیز ہیں۔

مغربی ذہن کے مطالعہ کی اہمیت جس طرح حکمت کا تقاضا ملک کے حالات کو سامنے رکھنا ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی دور میں جس تہذیب اور جس فلسفے کا غلبہ ہو، اور جن بھی سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور ثقافتی تصورات کا ذہنوں میں نفوذ عالمگیر پیمانے پر ہو، اُن کا داعیانِ حق کو شعور ہونا چاہیے۔

اہل مغرب آج فکری، اقتصادی، جنگی، سائنسی اور ثقافتی حیثیت سے دنیا کے امام بنے ہوئے ہیں۔ دوسری اقوامِ عالم کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی اس امامت سے متاثر ہیں۔ مسلمانوں کے پیش رو طبقے جو علمی، سیاسی اور اقتصادی برتری رکھتے ہیں، ان میں بکثرت افراد ایسے ہیں جو مغرب کی مرعوبیت اور تقلید میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو غیر ارادی اور غیر شعوری طور سے مغربیت کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ پھر ایک عنصر وہ بھی ہے جو مغربی تہذیب اور اس کے فلسفہ و نظریات کی مخالفت کے محاذ پر بہت اچھی خدمات انجام دینے کے باوجود کسی قدر مجبوری و اضطرار کے ساتھ آہستہ آہستہ غلط اثرات قبول کر رہا ہے، اور اس عنصر کی ایک نسل جہاں قدم جماتی ہے، دوسری نسل وہاں سے پسپائی اختیار کرتی ہے۔

اس تہذیب نے کائنات و حیات کا خالص مادی تصور، انسانیت کا حیوانی تصور اور اخلاق کا افادی تصور علمی اور تعلیمی لٹریچر اور پروپیگنڈے کے ذریعے ہر طرف پھیلا دیا ہے، اور ان تصورات کو اقوامِ مشرق اور مسلم معاشروں میں پہلے اپنے سیاسی سامراج کے ذریعے اور اب معاشی، فکری اور ثقافتی سامراج کے ذریعے ان کی جڑیں اور گہری کر دی ہیں۔ مغربی صنم خانۂ افکار میں تو ہیگل، مارکس، میکیاویلی، ڈاروِن، بینتھم اور فرائڈ کو دیوتاؤں کا مقام حاصل ہے ہی، ستم یہ ہے کہ فرزندانِ حرم کے دماغوں میں بھی ان کے استھان بن چکے ہیں۔

پس دنیا کے کسی کونے میں دعوت اسلامی کا کام کرنے والوں کے لیے ممکن نہیں کہ وہ جدید دَور کے پورے مادہ پرستانہ فلسفے، نظام سرمایہ داری، جمہوریت اور سوشلزم کا شعور حاصل کیے بغیر اور ان کے خلاف مضبوط تردیدی استدلال فراہم کیے بغیر دلوں کو فتح کر سکیں۔ جدید نظریات و تحریکات نے اس صحت مند ذہنی ماحول کو ختم کر دیا ہے جس میں آسانی سے فروغِ حق کا کام کیا جا سکتا تھا۔ انسانیت کے معیار میں اتنی پستی آگئی ہے، اخلاقی قدریں اس حد تک کمزور ہو چکی ہیں، دولت، جنس اور اقتدار اور دوسری خواہشات کا اتنا غلبہ ہو چکا ہے، حقوق اور مفاد کے لیے قوموں طبقوں اور افراد میں سرکشی اتنی بڑھ چکی ہے، اور انفرادی سطح پر جرائم اور اجتماعی دائرے میں جبر و تشدد کا ایسا دَور دورہ ہے کہ یہ ساری چیزیں جادۂ دعوتِ حق کے لیے خارزار بن چکی ہیں۔ محکم عقائد اور مسلّمہ اصول شک کی زد میں ہیں۔ ہر سچائی کے خلاف اتنے سوال اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، سوچ بچار کے عمل میں اتنی ٹیڑھ آگئی

ہے، اور افہام و تفہیم کے لیے جن مشترک اساسیات پر انحصار کیا جاتا تھا ان کے متزلزل ہو جانے سے ایسا انتشار و افتراق پیدا ہو گیا ہے کہ اسلامی دعوت کا کام پہلے سے مشکل تر معلوم ہوتا ہے۔

ان گزارشات کا مقصد مایوسی و پریشانی پیدا کرنا نہیں، اور نہ خود مجھے کوئی مایوسی و پریشانی لاحق ہے۔ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ جدید مغربی ذہن کا، جس کی پرچھائیں سے کچھ نہ کچھ حصہ ہر دماغ کو ملا ہے، بغور مطالعہ کیا جائے۔ آج کے فلسفہ اور سائنس اور سیاسی و اقتصادی نظریات کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے۔ اور مادہ پرستانہ ذہنیت پر مؤثر حملہ کرنے کے لیے اس کے کمزور رخنے نگاہ میں ہونے چاہییں۔ نیز اسلامی دعوت کے علمبرداروں کو مناسب استدلالی اسلحہ سے آراستہ ہونا چاہیے۔

موعظہ حسنہ حکمت کے بعد دعوت اسلامی کے لیے دوسری شرط اَلْمَوْعِظَةُ الْحَسَنَة ہے۔

موعظہ حسنہ کی شرط سے مراد یہ ہے کہ دعوت کی روح محبت و خیر خواہی ہونی چاہیے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کیا کہ اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ (روایت تمیم داری۔ مسلم)۔ داعی کا اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ شہرت و ناموری مطلوب نہ ہو۔ مخاطب کو بغض و حسد اور کینہ و نفرت اور تحقیر و تمسخر کا نشانہ نہ بنایا جائے، اشتعال و التہاب کا انداز نہ ہو۔ دلائل کلام اور امثال اور مصطلحات ایسے ہوں کہ جو کچھ کہا جائے وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے یا کم از کم توجہ کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ دعوت علمی سطح پر ہو یا عوامی سطح پر، تحریر کی شکل میں ہو یا تقریر کی صورت میں، موقع کے لحاظ سے مؤثر الفاظ و عبارات اور اسالیب بیان اختیار کیے جائیں۔ داعی کو یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ خداوند تعالیٰ کی شانِ کبریائی، رسولؐ کے شرف، قرآن کے مجد اور دین کے تقدس کا تقاضا یہ ہے کہ دعوت اسلامی کا وقار تباہ نہ ہونے پائے اور کسی بھی صورت میں سائلانہ طریق سے لجاجت اور خوشامد کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔

جدالِ احسن پھر ارشاد ہے کہ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ یعنی مکالمہ و مجادلہ نہایت خوبصورت انداز میں ہونا چاہیے۔ مطلوب یہ ہے کہ گفتگو میں اگر جدال اور مناظرے اور مجادلے کا انداز پیدا ہو جائے تو اس صورت میں داعیِ حق اپنے بہترین معیار کو برقرار رکھے۔ اس کے کسی انداز سے ظاہر نہ ہو کہ وہ حریف کو شکست دے کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، یا اس میں کبر و غرور کا رنگ ہے، یا وہ مغالطہ انگیزی اور حق پوشی کر رہا ہے۔ جدالِ احسن وہی ہے جس میں دماغی کشتی کا انداز پیدا نہ

ہو۔ اور اینچ پینچ سے کام لے کر زبردستی بات بنانے کی راہ اختیار نہ کی جائے
جدالِ احسن ترکیب پاتا ہے حسنِ مدعا، حسنِ استدلال اور حسنِ اظہار سے۔ اور ان خوبیوں کو اختلافی بحثوں میں برقرار رکھنا بڑا مشکل ہے کیونکہ دونوں طرف تیز و تند جذبات اُبھر آتے ہیں۔
مخاطب اگر استہزاء و استخفاف، مغالطہ انگیزی اور یاوہ گوئی پر اُتر آئے، مدمِ ضدا میں بدیہی صداقتوں سے بھی انکار کرنے لگے، افہام و تفہیم کے بجائے جھگڑالوپن کی راہ اختیار کرلے تو ظاہر ہے کہ جدالِ احسن کی فضا کو برقرار رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں داعیِ حق کو قَالُوا سَلَامًا (الفرقان ۶۳) پر عمل کرتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کرلینی چاہیے۔
بطور وضاحت میں یہاں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ لفظِ جدال جس کے مفہوم میں مکالمہ و مذاکرہ سے لے کر مباحثہ و مناظرہ تک کی مختلف اشکال شامل ہیں، اس کے ساتھ جب لفظ "احسن" بطور تعریف شامل ہو جاتا ہے تو مناظرہ وغیرہ کا جو بُرا مفہوم ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کی نفی ہو جاتی ہے۔ گفتگو اور بحث اور تبادلۂ خیالات کے لیے جب حُسنِ استدلال اور حُسنِ تکلم اور حُسنِ اختلاف کی شرائط سامنے رکھی جائیں گی تو گھٹیا طرز کے مقابلۂ کلام کا تصور باقی ہی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام مالکؒ نے مسئلہ تبلیغ پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جدال کی اصطلاح ہی کو در کنار رکھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اَلْمِرَاءُ وَالْجِدَالُ فِي الْعِلْمِ يَذْهَبُ بِنُورِ الْعِلْمِ عَنْ قَلْبِ الْعَبْدِ	علم میں جھگڑا اور بحثا بحثی علم کے نور کو بندے کے قلب سے نکال لے جاتی ہے۔

(المسالک۔ شرح موطا ج ا ص ۱۵)

سامعین میں سے ایک سائل نے پوچھا کہ جس شخص کو سنت کا علم ہو، کیا وہ حفاظتِ سنت کے لیے جدال کرسکتا ہے؟ (حضرت امام کے پُر زور جذبۂ حفاظتِ سنت کو غالباً سائل نے خاص طور سے سامنے رکھا) جواب میں فرمایا:
"نہیں، بلکہ اُسے چاہیے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے، پھر وہ مان لے تو بہتر، ورنہ سکوت اختیار کرے۔"
حضرت امام نے نفی جدالِ احسن کی نہیں کی، بلکہ مراء کے ساتھ محض جدال کی کی ہے۔ جہاں تک

جدالِ احسن کا تعلق ہے، سو اسی کا ایک پہلو اپنے مطالعۂ کتاب وسنت کی روشنی میں سائل کو بتایا۔ یعنی دوسروں کو کوئی بات کہنا یا بتانا درست، مگر یہ طرزِ فکر کہ مخاطب سے لازماً منوا کے چھوڑنا ہے اور اس پر ضرور اسے ٹھونسنا ہے، اس سے سارا کلام اور جدال غلط راستے پہ پڑ جائے گا۔ جدالِ احسن کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے سامنے دلائل وشواہد کی شکل میں غور وفکر کا مواد رکھ دیا جائے اور اسے ایسے معیارات سے متعارف کرایا جائے جن میں وہ اپنی آراء کو بطور خود پرکھ کر دیکھ لے کہ ان میں کتنا وزن ہے اور کیا کمزوری ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطب میں اپنی دعوت کے خلاف نفرت یا مزاحمت کے جذبات نہ پیدا ہونے دیے جائیں۔ جب کوئی شخص اپنی بات کو بزور اور بتکرار کہہ کہہ کر اور دوسرے کے خیالات کی تحقیر کر کر کے اپنا نقطۂ نظر ٹھونسنا چاہتا ہے تو مخاطب اگر بظاہر خاموش بھی ہو جائے تو بھی اس کے دل کے دروازے نہیں کھلتے۔

تو مطلوب جدالِ مطلق نہیں، جدالِ احسن ہے!

(باقی)

ضروری تصحیح

ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی میں حسبِ ذیل غلطی کی اصلاح کر لی جائے۔

صفحہ ۱۲۱۰ سطر ۹ فَاخۡتُلِفَ کے بجائے فَاخۡتَلَفَ لکھا جائے۔